

میرا ووٹ کدھر گیا؟

2018ء کا الیکشن جولائی میں ہوا تھا۔ حد درجہ گرمی اور جس والا دن۔ میرا ووٹ لائل پور میں درج تھا۔ آج بھی وہیں ہے۔ وجہ صرف یہ کہ اپنے آبائی شہر سے کسی صورت تعلق نہیں توڑ سکتا۔ فیصل آباد سے نکلے ہوئے دہائیاں بیت چکی ہیں، مگر کسی اور شہر سے وہ وابستگی بن ہی نہیں پائی جو اس قصبہ سے قائم ہے۔ ووٹ ڈالنے کے لئے لاہور سے پولنگ سٹیشن پہنچا۔ گرین ٹاون جسے پرانے لوگ راجہ والا کے نام سے جانتے ہیں۔ وہاں ووٹ درج تھا۔ واحد وجہ صرف یہ تھی کہ والدین نے ریٹائرمنٹ کے بعد وہاں ایک سادہ سا گھر تعمیر کیا تھا۔ چھوٹا بیٹا حمزہ باہر سے آیا ہوا تھا۔ ہم دونوں قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دو چار فوجی حد درجہ مستعدی کے ساتھ ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔ قطار حد درجہ لمبی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد ہم دونوں اپنا اپنا ووٹ ڈال پائے۔ شدید گرمی میں حد درجہ تھکا دینے والا کام تھا۔ پسینہ سے شرابور جب گاڑی کی طرف جانے لگا تو آج کل کی حکومتی جماعت کے ایم این اے کے امیدوار سے رسمی سی ملاقات بھی ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ بڑے آرام سے جیت جائے گا۔ ایم این اے سے اس لئے بھی واقف تھا اور ہوں کہ دونوں ڈویژنل پبلک سکول میں پڑھتے رہے تھے۔ خیر ملنا جلنا کافی حد تک محدود رہا ہے۔ ہاں ایک اور بات صوبائی اسمبلی کے جس صاحب کو ووٹ ڈالا۔ نہ اسے جانتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی واقفیت تھی۔ حد درجہ گرم موسم میں ووٹ ڈال کر سیدھا واپس لاہور آ گیا۔ جسے اب میں کنکریٹ اور آبادی کا سیلاب سمجھتا ہوں۔ قومی اسمبلی کے جس امیدوار کو ووٹ ڈالا وہ توقع کے مطابق جیت گیا۔ حق رائے دہی استعمال کرنے والے دن سے لے کر آج تک پھر کبھی بھی اس سے بات نہیں ہوئی۔ شاید ہم دونوں میں کوئی ایسی قدر مشترک ہی نہیں رہی کہ گفتگو کی گنجائش ہو۔ دو ڈھائی برس پہلے اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ موصوف جہانگیر ترین گروپ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ترین کو جس طرح خان صاحب کے نزدیکی ”بابوؤں“ نے تضحیک کا نشانہ بنایا۔ فطری نتیجہ تھا کہ وزیراعظم سے دوری اختیار کر لیں۔ اس میں کسی قسم کے تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ عمران خان کے ذاتی سٹاف نے وزیراعظم کے ہر خیر خواہ اور دوست کو دشمن بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ چند افسروں کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ ان کی اہلیت کا بھی بہت حد تک معلوم ہے۔ مگر خان صاحب کے ساتھ جو

بنیادی ظلم ہوا ہے یا جو زیادتی انہوں نے خود اپنے ساتھ کی ہے، وہ صرف یہ کہ اپنے دوستوں کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر اسے ناگوار ذاتی دشمنی تک لے گئے۔ جہاں گہر ترین اور متعدد تحریک انصاف کے محسنوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ جس ایم این اے کو میں نے ووٹ ڈالا تھا۔ وہ بھی ترین گروپ میں صرف اس لئے گیا کہ اس کو ہر کام میں رکاوٹ مل رہی تھی۔ خیر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ بڑی پارٹیوں میں گروہ بندی چلتی رہتی ہے۔ ایک برس پہلے، فیصل آباد سے ایک معتبر سیاسی صاحب ملنے کے لئے گھر تشریف لائے۔ تو انہوں نے عجیب بات بتائی۔ وزیر اعظم سرکاری دورہ پر لائل پور آئے۔ تمام عوامی نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ مگر اس مخصوص ایم این اے کو شرف ملاقات نہ مل پایا۔ یہ عمل ذاتی بے عزتی کرنے کے مترادف تھا۔ خیر سیاسی معاملہ تھا۔ کہیں بات نہیں کی۔ ویسے اس حکومت میں ذاتی طور پر بھی شدید ناانصافی کا شکار رہا ہو۔ آج تک کسی سے گلہ نہیں کیا۔ حالانکہ بخوبی جانتا ہوں کہ خان صاحب کے کس بابو نے کونسی رنجش کی بدولت میرے ساتھ ظلم کیا تھا۔

دس بارہ ماہ سے معلوم تھا کہ متعدد ایسے ایم این اے ہیں جنہیں دربار سے نکال دیا گیا ہے اور ایک سیاسی لاوہ اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ صوبہ پنجاب میں صورتحال قدرے بہتر رہی۔ جس کو وزیر اعلیٰ سے گلہ تھا، وہ گورنر سے مل کر دل کا غبار نکال لیتا تھا۔ جو دونوں سے ناخوش ہوتا، وہ صوبائی اسمبلی کے سپیکر کے پاس چلا جاتا۔ یہاں کے معاملات اچھے یا برے، بہر حال، مرکز سے قدرے بہتر چل رہے تھے۔ سیاست میں حکمران کی کسی بھی کمزوری کا بھرپور فائدہ اپوزیشن ضرور اٹھاتی ہے۔ اور اٹھانا بھی چاہیے۔ یہی ہماری سیاست ہے۔ اچھی یا بری، یہاں تو یہی کچھ ہی ہے۔ بعینہ یہی کچھ علیم خان کے ساتھ ہوا۔ ان کو عہدہ تو دے دیا گیا۔ مگر جزیات پر کوئی غور نہیں ہوا۔ معاملہ یہ کہ وزیر اعلیٰ کے بعد سب سے طاقتور عہدے پر فائز رہنے کے باوجود ان کے معاملات بہتر طریقے سے حل نہیں کیے گئے۔ پھر جس نے پنجاب میں وزیر اعلیٰ بننے کی معمولی سی بھی جستجو کی، اسے حد درجہ ذلیل کیا گیا۔ بلکہ نشان عبرت بنا دیا گیا۔ درون خانہ سب جانتے تھے کہ کس کے حکم پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ کئی سیاست دانوں نے ناقابل تردید ثبوت پیش کیے ہیں کہ ان کو پابند سلاسل کرنے کا اصل حکم بذات خود سولین باختیار ترین سیاست دان نے صادر کیا تھا۔ انہوں نے برملا شکایت کی کہ یہ ظلم بے جا ہے اور اس میں زیادتی ہو رہی ہے۔ پر دربار تک ان کی آواز نہیں پہنچی یا نہیں پہنچائی گئی۔ نہ بھی عین ممکن ہے کہ بادشاہ کو بتا گیا ہو مگر اس کے کان رجون نہ رینگے

ہو۔ علیم خان اور جہانگیر ترین نے جس طرح خان صاحب کو عزت و احترام دیا، تو قیر کی مالی وسائل مہیا کیے۔ وہ ایک دم فراموش ہو گئے۔ اہم ترین کارسرازان مشیروں کے ذمہ لگا دیئے گئے جو کونسلر کا الیکشن تک نہیں جیت سکتے۔ مگر چرب زبانی کی بدولت دربار شاہی میں وہی معتبر ٹھہرائے گئے۔ انہوں نے وزیراعظم کو اس طرح شیشے میں اتارا کہ ہر طرف امن اور شانتی نظر آنی شروع ہو گئی۔

ایک سینیٹر بیورو کریٹ نے بتایا کہ اصل کام کسی بھی وزیراعظم کو انٹر کنڈیشن ٹرین کے اس ڈبے میں بیٹھانا ہوتا ہے، جس کے شیشے سبز رنگ کے ہوں۔ اگر آپ اندر ٹھنڈے ماحول میں بیٹھے ہوں، تو باہر کی بنجر زمین پر بھی ہریالی ہی ہریالی دکھائی دے گی۔ خان صاحب اپنی افتاد طبع کے تحت بہت جلدی ہی ٹرین کے اس ڈبے میں سوار ہو گئے جس سے باہر دیکھنے پر ہر طرف بادلوں کی ٹھنڈک اور خوبصورتی نظر آتی ہے۔ عام لوگوں کے مسائل اور ان کے غم بوجھ محسوس ہوتے ہیں۔ سینئر بابوؤں نے دربار کے ایسے ایسے قصے سنائے کہ ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر شاید اب ماتم کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ خان صاحب عملی طور پر بچگانہ رویہ کو اپنا ہنر سمجھتے رہے۔ ہوا یہی کہ سنجیدہ لوگ ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ اس وقت سیاسی طور پر وہ مکمل طور پر تنہا ہیں۔ یہ بات انہیں معلوم ہو چکی ہے۔ مگر اب تو شام ہونے کو ہے۔ اگر سمجھ آ بھی گئی ہے تو بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ مشیران خاص اب اپنی اپنی جان بچانے میں مصروف کار ہیں۔ ہر جانب معافی کی درخواستیں کی جا رہی ہیں۔ وہ ہیڈ باجو جس نے پورے ملکی نظام میں وزیراعظم کے لئے تلخیاں بڑھائیں، سنا ہے وہ بیرون ملک جانے کے درپے ہے۔ معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ تصادم اور بے یقینی سرخ لکیر سے باہر نکل رہی ہے۔ خلق خدا پریشان ہے۔ اور شعور رکھنے والے افراد حیران ہیں کہ معاملہ کس طور بہتر ہو پائے گا۔ مگر آج بھی دربار سے اس سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں ہو رہا، جو ایک دانشور حکمران کا وظیرہ ہوتا ہے۔ منفی سیاسی بیانات کی بھرمار مار کٹائی اور پکڑ لوڑگا، مار دوڑگا، دیکھ لوڑگا، یہ جملے آج بھی جلسوں کی زینت بن رہے ہیں۔ لوگوں میں وقتی طور پر ٹھٹھا لگانے کا باعث تو یہ جملے بن جاتے ہیں۔ مگر کشیدگی میں ناقابل برداشت اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ عمل حد درجہ غیر دانشمندی سے روز بروز فروغ پا رہا ہے۔ عقل اور دلیل کی بات کرنے والے افراد وزیراعظم کے دربار میں کونے کی کرسیوں پر موجود ہیں۔ وہ اب خاموشی سے تماشا دیکھنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر رہے۔

عرض صرف یہ ہے کہ خان صاحب کے سیاسی مخالفین نے ان کی زبان اور عمل کی لغزشوں سے کمال فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنے تمام سیاسی گناہ معاف کروا کر دوبارہ تخت پر قبضہ کرنے کی یلغار شروع کر دی ہے۔ پر یہ تو سب کچھ ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ خان صاحب نے اپنے دوستوں کو ہر ممکنہ حد تک اپنے خلاف کر ڈالا ہے۔ جو مالی استطاعت رکھتے تھے اور خان صاحب کے ایک اشارے پر تجوریوں کے مونہہ کھول دیتے تھے سب پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ اب سندھ ہاؤس میں بیس بائیس باغی ممبران کے رہنے کا چرچہ ہے۔ میڈیا پر ان کے بیانات ہر دم غالب نظر آ رہے ہیں۔ تحریک عدم اعتماد میں اگر یہ ممبران خان صاحب کے خلاف ووٹ ڈالتے ہیں تو حکومت اسی دن گر جائے گی۔ شائد خان صاحب کو بھی ادراک ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے مزاج میں مزید تلخی آتی جا رہی ہے۔ جس ممبر کو طالب علم نے ووٹ ڈالا تھا وہ بھی حکومت سے نکل چکا ہے۔ پارٹی بھی چھوڑ چکا ہے۔ خان صاحب رہتے ہیں یا نہیں۔ اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف یہ سوال کر رہا ہوں کہ میرا ووٹ کدھر گیا؟ شاید ذاتی نفرتوں اور سیاسی مجبوریوں کے سیلاب میں یورش آلام کا شکار ہو چکا ہے۔ مجھے تو اپنے ووٹ کی بے توقیری پر شدید دکھ ہے!